R. No. 2186/57 Regd. No. L. 922

انجمن ترقی اُردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

تاریخ اشاعت ۱-۶-۶۶

ٹیلی فون - ۲۹
قیمت تین پیسہ
فی پرچہ ۱۵ پیسے

جلد ۲۵ - شمارہ ۲۱	اڈیٹر: آل احمد سرور	یکم جون ۱۹۶۶ء

آل احمد سرور

نیاز کی یاد میں

"نگار" پاکستان کی تازہ ترین اشاعت سے حضرت نیاز فتح پوری کی خطرناک علالت کی خبر ملی تھی اور ان کی خیریت معلوم کرنے کا ارادہ تھا۔ دوسرے دن ریڈیو پر اعلان ہوا کہ وہ چل بسے۔

نیاز کی موت ایک فرد کی موت نہیں، ایک روایت، ایک اسلوب، ایک نسل، ایک رجحان، ایک وضع، ایک انداز کی موت ہے۔ علم و فضل، فکر و نظر، انفرادیت و بصیرت، ادب و انشا، عزم و استقلال کی کتنی ہی حکایتیں ان کے ساتھ ختم ہوگئیں۔ رہے نام اللہ کا۔

آج میری عمر کے جتنے اشخاص ادب کے کوچے میں گامزن ہیں، انھوں نے جب ہوش سنبھالا تو نیاز کے چرچے سُنے۔ میں غازی پور میں آٹھویں درجے میں پڑھتا تھا۔ جب ششماہی امتحان میں درجے میں سب سے زیادہ نمبر لانے کے باوجود حساب میں فیل ہوگیا تو نارمل اسکول کے ایک استاد حساب پڑھانے کے لیے رکھے گئے۔ یہ حضرت "نگار" کے خریدار تھے اور نیاز کے عاشق۔ حساب سیکھنے کے دوران میں استاد کے شوق کا علم ہوا تو میں نے بھی ان سے مانگ کر "نگار" کے پرچے پڑھنے شروع کیے اور میں بھی "نگار" اور اس کے اڈیٹر کا پرستار ہوگیا۔ حسن اتفاق سے نیاز کے ایک دوست عبدالرؤف غازی پور میں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ میرے والد سے ملنے کبھی کبھار آتے تھے۔ ان سے اکثر نیاز کی باتیں ہوا کرتیں۔ کچھ دن بعد نیاز ان سے ملنے غازی پور آئے۔ وہیں میں نے انھیں پہلی دفعہ دیکھا اور کچھ خاموش اور مغرور سے آدمی معلوم ہوئے۔ مگر ان کے اسلوب کا جادو چل چکا تھا۔ پھر کوئی وجہ نہیں تھی کہ نیاز آٹھویں درجے کے ایک طالب علم کی طرف خاص طور سے توجہ کرتے۔ رؤف صاحب کا یہ جملہ آج تک یاد ہے کہ اس زمانے میں نیاز کے یہاں عورت اور شباب کے سوا کوئی دوسرا موضوع نہ تھا۔

یاد نہیں پڑتا کہ لکھنؤ کے قیام سے پہلے نیاز صاحب سے کب کھل کر باتیں ہوئیں۔ ہاں یہ یاد ہے کہ نیاز صاحب نے جب سنہ ۱۹۴۰ء کے خاص نمبر میں شعرا کا اپنا انتخاب شائع کیا تو اس کے بعد چند نقادوں کے ساتھ مجھ سے بھی درخواست کی کہ میں اس نمبر پر تبصرہ کروں۔ یہ تبصرہ سنہ ۱۹۴۱ء کے خاص نمبر میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد نیاز صاحب کی فرمایش پر میں نے ریاض نمبر کے لیے مضمون لکھا۔ نیاز صاحب کے وہ خط جو "نگار" میں شائع ہوتے تھے بڑے رنگین اور شوخ ہوتے تھے لیکن مضمون نگاروں کو وہ کاروباری خط لکھا کرتے تھے۔ فلاں نمبر نکل رہا ہے۔ فلاں تاریخ تک مضمون لکھ سکیں تو عنایت ہوگی۔ اس کے بعد ایک خط یاد دہانی کا کہ وقت گزرا جا رہا ہے اور پرچے کی کتابت شروع ہونے والی ہے۔ اس کے بعد بھی میری طرف سے خاموشی ہوتی تو نیاز صاحب بھی سکوت اختیار کر لیتے۔ پرچہ وقت پر چھپ جاتا۔ خواہ اس میں بیشتر مضمون نیاز کے ہی کیوں نہ ہوتے۔ سنہ ۱۹۳۲ء اور سنہ ۱۹۳۵ء کے درمیان جب کبھی لکھنؤ جانا ہوا تو نیاز صاحب سے ملا بھی، لیکن سرسری سی ملاقات رہی۔

سنہ ۱۹۴۶ء میں لکھنؤ پہنچا تو کام شروع کرنے کے فوراً بعد نیاز صاحب کے یہاں حاضری دی۔ اکثر دیر تک اور کھل کر باتیں ہوئیں۔ نیاز صاحب نے جس طرح میرے لکھنؤ یونیورسٹی میں آنے پر مسرت کا اظہار

اس شمارے میں

کیا۔ اس سے بڑی خوشی ہوئی۔ یونیورسٹی کے اور لکھنؤ کے ادیبوں کے قصے سناتے رہے۔ وہ لکھنؤ والوں سے خوش نہیں معلوم ہوتے تھے۔ ادب میں نئے خیالات کی قدر کرتے تھے مگر نئے لکھنے والوں کی فحش سے بے پروائی پر سخت برہم تھے۔ ترقی پسند ادب کو وہ ترقی پسند زیادہ اور ادب کم سمجھتے تھے۔ مذہب میں عقلیت کو رہبر مانتے تھے مگر اسلام کی عظمت کے قائل تھے۔ ان سے باتیں کرکے حیرت ہوئی کہ لوگوں نے ان پر الحاد کا الزام کیسے لگایا۔ جوش و جگر دونوں کے قائل نہ تھے۔ نئے لکھنے والوں کی بڑی ہمت افزائی کرتے تھے۔ مگر انھیں معاوضہ دینے کی ضرورت کم ہی سمجھتے تھے۔ چونکہ نگار میں کسی کی تخلیق کا چھپ جانا ہی ادبی شہرت کا باعث ہوتا تھا اس لیے انھیں مضمون مل ہی جاتے تھے۔ گو وہ کسی کے محتاج نہ تھے۔ نگار میں مضمون، ادبی تنقید، افسانہ، انشائیہ، تبصرہ، ترجمہ کسی میں بند نہ تھے۔ جتنے عرصے تک جیسی پابندی سے اور جس معیار کے ساتھ انھوں نے رسالہ نگار نکالا اس کی مثال ہماری ادبی دنیا میں کم ہی ملے گی۔

وہ نگار کے ایڈیٹر ہی نہیں، منیجر بھی تھے اور طابع و ناشر بھی اور اس کے کلرک بھی۔ اپنی بیشتر کتابیں بھی انھوں نے اپنے پریس میں چھاپیں اور اپنی بک ڈپو سے فروخت کیں۔ لکھنؤ کے دس سالہ قیام میں، نیاز صاحب سے خاص قربت رہی۔ ان کے ساتھ کئی انگریزی فلم دیکھے۔ ادبی جلسوں اور کانفرنسوں میں شرکت کی۔ وہ اکثر گھر پر تشریف لاتے تھے۔ جوش بلگرامی مرحوم سے ملاقات انھیں کی وساطت سے ہوئی۔ انھوں نے اصرار کرکے "تنقیدی اشارے" کا ایک ایڈیشن "نگار بک ڈپو" کی طرف سے شایع کیا۔ ان کی فرمائش پر میں نے "نگار" میں "لکھنؤ اور اردو ادب" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا جس کو انھوں نے بہت پسند کیا۔ ان سے ہندوستان، پاکستان، روس، امریکہ، گاندھی، ابوالکلام آزاد، یگانہ، اثر لکھنوی، مولانا عبدالماجد دریابادی، جوش، جگر، نئی شاعری، غالب، اقبال، غرض دنیا بھر کے موضوعات پر باتیں ہوئیں۔ ریڈیو کے لیے ساتھ بیٹھ کر مباحثے لکھے۔ ان کے ساتھ بے تکلفی ہو گئی۔ مگر نیاز صاحب سے بے تکلفی نہیں ہو سکی۔ مجھے محسوس ہوا کہ نیاز صاحب لیے دیے رہنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ ان کا ایک خاص مزاج ہے۔ پسند اور ناپسند کے واضح معیار ہیں۔ افکار کے سلسلے میں بھی اور اشخاص کے سلسلے میں بھی۔ ان کا ذہن آگے۔ لکھنے کا عادی تھا دل لکھنؤ کی اس فضا سے بسا ہوا تھا جب در و دیوار سے عبیر و گلال برستا تھا، اور فضا میں رامش و رنگ کی بارش تھی۔ ان کے کوئی دو تھے مولوی اور عورت۔ مولوی سے انھیں نفرت تھی۔ عورت کے وہ آخر عمر تک پرستار رہے۔

نیاز صاحب مل کر کام نہیں کر سکتے تھے۔ وہ تنہا چلنے کے عادی تھے۔ وہ واقعی فارسی علم رکھتے تھے۔ عربی، فارسی ادب پر تو انھیں گہرا عبور تھا ہی۔ کلاسیکل اردو شاعری کے ہر رمز و ایما سے آشنا تھے۔ عروض کے ماہر تھے۔ زبان و بیان کے ایسے نباض تھے کہ ذرا سی لغزش بھی فوراً محسوس کر لیتے تھے۔ مغربی ادب میں جدید میلانات سے زیادہ واقف نہ تھے لیکن مغربی ادب خصوصاً انگریزی ادب کے مشاہیر کے متعلق اچھا علم رکھتے تھے۔ بڑے رکھ رکھاؤ کے آدمی تھے۔ ادب ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ ادب کی آمدنی پر ہی ان کا دارومدار تھا۔ انھوں نے اپنے رسالے اور کتابوں کی آمدنی پر خاصی صاف ستھری زندگی بسر کی۔ مگر اپنی آن بان ہر حال میں قائم رکھی۔ ان کے یہاں بڑی وضعداری بھی۔ دوستی اور تعلقات کو ساری عمر نباہتے تھے۔ ایک زمانے میں فلم کا کاروبار بھی کیا۔ حضرت گنج میں کچھ کمرے کرائے پر لیے۔ نشاط کا دفتر قائم کیا۔ خود ایک کہانی لکھ رہے تھے۔ ذوقی صاحب ان کے مددگار تھے۔ یہ سلسلہ چند مہینے چل کر ختم ہو گیا۔ نیاز صاحب اس کوچے کے اسرار و رموز سے واقف نہ تھے۔

نیاز صاحب کے پاکستان جانے کا مجھے بڑا رنج ہوا۔ نیاز صاحب سے یہ امید نہ تھی۔ میرا خیال تھا کہ نیاز کبھی کبھار عزیزوں اور احباب سے ملنے پاکستان کا پھیرا کرتے رہیں گے لیکن ان کا قیام ہندوستان میں ہی رہے گا۔ حکومت ہند نے ان کی ادبی عظمت کے اعتراف میں انھیں پدم بھوشن کا اعزاز عطا کیا۔ چند ماہ بعد وہ چلے گئے۔ مومن کے عاشق کو مومن کا یہ شعر شاید یاد نہ آیا ؎

عمر ساری تو کٹی عشقِ بتاں میں مومن
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

پاکستان جاتے ہی نیاز نے پہلا کام یہ کیا کہ نگار پھر جاری کیا "نگار پاکستان" کے نام سے۔ یہ پرچہ بھی "نگار" کی طرح باقاعدہ نکلتا رہا اس کے نیاز نمبر میں ان کے متعلق بہت سے اچھے مضامین شائع ہوئے بالآخر کینسر کے موذی مرض نے انھیں دبا لیا اور آخر مئی میں ان کا انتقال ہوا۔ نیاز کے ساتھ اس دور کی سب سے جامع، سب سے ہمہ گیر ادبی شخصیت ہم سے رخصت ہو گئی۔ (باقی آئندہ)

بھوپال میونسپل کونسل
اردو کے دانشوروں کا استقبال کرے گی اور انعام دیگی

بھوپال۔ ۲۰ مئی۔ کل یہاں میونسپل کونسل کی ادبی انعامات تقسیم کرنے والی کمیٹی نے بھوپال کے دس اردو اور دس ہندی کے فن کاروں کو پانچ پانچ سو روپیہ ان کی ادبی خدمات کے پیش نظر انعام دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ انعامات ایک استقبالیہ تقریب میں مئی کے آخری ہفتہ میں دیے جائیں گے۔

جن اردو دانشوروں کو انعامات دینے کا اعلان کیا گیا ہے۔ ان کے نام یہ ہیں

۱۔ علامہ محوی صدیقی
۲۔ جناب ایم عرفان
۳۔ جناب اطہر سعید خاں اختر
۴۔ جناب مقصود عرفان
۵۔ جناب وکیل بھوپالی
۶۔ جناب مقصود عمرانی
۷۔ ڈاکٹر شفا گوالیاری
۸۔ جناب محمود الحسینی
۹۔ جناب قمر جمالی
۱۰۔ جناب عشرت قادری

(ایک نامہ نگار)

ڈاکٹر جعفر حسن

بھاشائی قانون

بننے کے بعد
آندھرا پردیش میں اردو کی حیثیت

آندھرا پردیش میں تیلگو کو سرکاری زبان بنانے والا قانون پاس ہوگیا۔ اس قانون کے مطابق اردو کی کیا حیثیت رہی؟ یوں سمجھئے کہ جنھیں اشرفی ملنے والی تھی، انھیں دھیلا ملا، جو خزانے کے مدعی اور مستحق تھے انھیں صرف ایک روپیہ ملا — وہ بھی کھوٹا!

چونکہ مقامی اخباروں کے اڈیٹر، انجمن ترقی اردو (ہند) اور اس کی آندھرا کی شاخ سے وابستہ کئی افراد، صدق اور صداقت کے نیم مبلغ نیم محتسب وکالت کرنے والے بعض قانونی زبان کی موشگافیوں سے واقفیت رکھنے والے بعض ایڈوکیٹ اور یادش بخیر سیاسیات کے مجسم عالم و ماہر اور ان کے سوا مختلف پیشوں، ہنروں اور اداروں سے وابستہ ہستیاں بار بار اعلان کر چکی تھیں کہ

"آندھرا پردیش میں اردو دوسری علاقائی زبان قرار دی جا چکی!"

اس لیے نہ صرف بھولے بھالے افراد خوش فہمی میں مبتلا ہو گئے بلکہ انجان بننے والوں نے مرعوبیت، لالچ، خوف زدگی عشق آمد یا خود غرضی سے یہ مغالطہ پھیلایا کہ اردو کو آندھرا پردیش میں اس کا مستحق درجہ مل چکا۔

اس پروپگنڈے سے بیرونی مشاہیر بھی اس درجہ متاثر ہوئے کہ ذاتی تحقیق اور پوچھ تاچھ کے بغیر وہ بھی لیجئے راج دھانی، اتر پردیش، بہار، مغربی بنگال اور مہاراشٹر سے آئے ہوئے معروف افراد نے تحریر و تقریر میں حکومت آندھرا پردیش کی بلند بینی، وسعت نظری، قومیت سازی، دریادلی، حکمت عملی، تدبر، دور اندیشی، رواداری، اقلیت نوازی وغیرہ کی دل کھول کر داد دی اور یہاں تک کہا کہ

"اردو کو اس کا صحیح مقام اور مستحقہ درجہ دے کر آندھرا پردیش نے سماجی تناؤ اور کھنچاؤ کم کرنے اور ہندستان کا بھاشائی مسئلہ سلجھانے کے لیے ٹھیک راستہ اختیار کیا ہے!"

یہ اور اسی قسم کی تعریفیں مقامی اور بیرونی اخباروں میں بیسیوں بار (بلا مبالغہ بیسیوں بار) نظر سے گزریں۔

آندھرا پردیش کے ارباب سیاست کو یقیناً بڑا اطمینان ہوا ہوگا کہ ان کا داؤ چل گیا، انھوں نے خوب تھپکی دی، اچھی چال چلی خوب سبز باغ دکھایا!

اب جو قانون بنا اس کے لفظوں پر غور کیجئے

The Government (of Andhra Pradesh) May from time to time, by notification in the Gazette direct The use of Urdu or any other language or languages, in addition to The Telugu language, in The interest of Persons speaking These languages, in such Areas and for such Official Purposes of The state and for such Periods as may be specified in The notification

یعنے ریاست کے مخصوص سرکاری اغراض کے لیے حکومت (آندھرا پردیش) جب چاہے تو گزٹ میں اعلان کر کے معین کردہ مدت کے لیے اور مختص کیے ہوئے رقبے میں جس کی صراحت اعلامیہ میں کی جائے گی تلگو زبان کے سوا اردو یا کسی اور زبان یا زبانیں بولنے والوں کے مفاد کی خاطر اس زبان یا ان زبانوں کے استعمال کرنے کی ہدایت دے سکتی ہے۔

مطلب یہ کہ اردو عام طور پر نہیں، صرف مخصوص سرکاری اغراض کے لیے سارے آندھرا پردیش کے لیے نہیں، صرف مختص کردہ رقبوں کی حد تک، ہر وقت یا ہمیشہ کے لیے نہیں، صرف معین کی ہوئی مدت کے لیے صرف اردو بولنے والوں کے مفاد کے مد نظر نہیں بلکہ دوسری اقلیتی زبان یا زبانیں بولنے والوں کی طرح، اسی درجے، سطح یا معیار پر استعمال کی جا سکتی ہے وہ بھی جب گزٹ میں اعلان ہو چکا ہو۔ سرکاری یا نیم سرکاری یا نظمی سرکاری اور نام نہاد سرکاری اغراض میں تاویلیں یقینی ہیں گزٹ میں اعلان تاخیر سے ہو یا بعد از وقت ہو تو کیا کیا جا سکے گا؟

یہ بھی اچھی طرح ذہن نشین کر لیجئے کہ یہ اعزاز تنہا اردو کو نہیں ملا بلکہ دوسری اقلیتی زبانیں اسی طرح معزز اور مفتخر قرار دی گئیں چنانچہ مرہٹی، تامل، اوریا اور کنڑی کو وہی مرتبہ بخشا گیا جو اردو کو حاصل ہوا حالانکہ ۱۹۶۱ء کے مردم شماری (census) کے مطابق جن لوگوں نے اردو کو مادری زبان لکھوایا ان کی تعداد ۴۵ لاکھ تناسب ۸ فی صد اور تامل مرہٹی، اوریا، کنڑی وغیرہ کا تناسب ایک ایک اور ڈیڑھ ڈیڑھ فی صد کے درمیان تھا۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ گنتا دے میں بہتیرے لوگوں نے مادری زبان کی حیثیت سے ہندی لکھوایا نہ کہ اردو (باقی صفحہ)

لہ انگریزی عبارت جنوبی ہندستان کے مشہور اور اعلیٰ معیاری اخبار "ہندو" سے ماخوذ ہے۔ توجہ کی خاطر میں نے کئی لفظ بڑے حرفوں میں لکھے ہیں۔ ترجمہ میں نے کیا ہے۔ انتہائی دیانت کے باوجود اصل اور ترجمے میں بے ربطی یا نقص ہو تو میری محدود قابلیت کا نتیجہ ہے اگر کوئی بہتر یا صحیح ترجمہ بحوالہ حیدرآباد ہم کو بھیجنے کی زحمت کرے تو مہربانی ہوگی۔

(اداریہ)

اردو کا مسئلہ

دہلی میں اردو کے استادوں کا جو اجتماع ہوا تھا اس میں اردو کا مسئلہ پھر اٹھا اور اس سے چند اچھے پہلو نمایاں ہوگئے۔ استادوں نے بتایا کہ اگرچہ آزادی کے بعد اردو بہت سی دشواریوں میں گرفتار ہوگئی ہے لیکن اس کی اعلا تعلیم ترقی کر رہی ہے۔ پہلے بہت کم یونیورسٹیوں میں اردو کی اعلا تعلیم ہوتی تھی، لیکن اب ایسی یونیورسٹیوں کی تعداد کافی بڑھ گئی ہے جہاں اردو کی اعلا تعلیم ہوتی ہے۔ اس سے پہلے ایک موقع پر انجمن ترقی اردو کے سکریٹری بتا چکے ہیں کہ آزادی کے بعد اردو اخباروں کی اشاعت بڑھی اور کتابیں بھی زیادہ چھپنے لگی ہیں۔ یہ دونوں باتیں ایسی ہیں جو بتاتی ہیں کہ اردو کے اندر بڑھنے اور پھیلنے کی صلاحیت کتنی ہے۔ اور یہ کہ ایسی زبان نہیں ہے جس کو اگر سرکار کا سہارا نہ ملے تو ترقی نہ کرے۔ اردو کی زندگی بھی یہی رہی ہے کہ اس نے اپنی زندگی کے سخت دور اپنی اندرونی طاقت کے سہارے گزارے ہیں۔ مغل دور کی سرکاری زبان فارسی تھی، اور آخر تک فارسی ہی رہی۔ یہاں تک کہ اودھ کی حکومت کی بھی سرکاری زبان فارسی تھی۔ البتہ بالکل آخر دور میں جب کہ کچھ اردو استعمال ہونے لگی تھی۔ ایک طرف یہ تھا اور دوسری طرف اردو نے اپنا بچپن ان ہی حالات میں گزارا اور صرف اپنے بل بوتے پر جوان ہوئی۔ جب کبھی ہم اردو کی طرف سے مایوس ہونے لگتے ہیں تو اسی وقت اردو کی یہ اندرونی خوبیاں ہماری ہمت بندھاتی ہیں اور ہم کو اس کے کامیاب مستقبل کی طرف سے اطمینان دلاتی ہیں۔ ایک چیز ایسی بھی ہے جو اس کامیاب مستقبل کا یقین دلاتی ہے۔ وہ ہے فلموں کی دنیا میں اردو کی مقبولیت۔ دھیرے دھیرے فلم کی زبان فصیح اردو ہوتی جا رہی ہے۔ اور صرف اتنا ہی نہیں بلکہ اردو غزلیں دن بدن فلمی دنیا میں زیادہ رائج ہوتی جا رہی ہیں اور ان کے ریکارڈ ریڈیو پر بجائے جا رہے ہیں۔ اور لوگ ان غزلوں کو گلیوں اور بازاروں میں گاتے پھر رہے ہیں۔

اس وقت قومی زبان کی اشاعت کا سب سے بڑا ذریعہ فلم ہے۔ کوئی ایسا ذریعہ نہیں ہے جو طاقت میں اس سے زیادہ ہو۔ ریڈیو اس کے مقابل میں کچھ نہیں ہے۔ اگر فلمی زبان دھیرے دھیرے اردو ہو رہی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہندوستان کے عام لوگ اردو کو زیادہ پسند کر رہے ہیں اور اس زبان کی طرف جھک رہے ہیں۔ یہ وہ چیز ہے جس کو نہ تو قانون روک سکتا ہے نہ کسی تحریک یا اپیل سے نہ اس پر کسی سیاسی جماعت کا زور پڑ سکتا ہے اور نہ حکومت کی کسی طاقت کا۔ یہاں تک کہ اخباروں، ریڈیو اور کتابوں کی زد سے بھی یہ ذریعہ محفوظ ہے۔ اس دنیا میں جو زبان بن رہی ہے وہ پھیلتی چلی جاتی ہے۔ اور بیس تیس سال میں وہ اگر قومی زبان نہ ہوگی، تو کم سے کم قومی زبان کا اسی فیصدی حصہ ضرور ہوگی۔

اردو کے مستقبل کی طرف ہم اشارہ کرنا یوں ضروری سمجھتے ہیں کہ مایوسی کے بادل چھٹتے ہیں اور لوگوں میں جد و جہد کرنے کا حوصلہ ابھرتا ہے۔ اگر اردو کے لیے جد و جہد کرنے کا حوصلہ نہ رہا تو یہ چیز اس کی اندرونی طاقت کو کمزور کر دے گی۔

اردو کے معاملے میں ہم کو حکومت سے بھی زبردست شکایتیں ہیں اور سیاسی پارٹیوں سے بھی۔ نہ حکومت نے اردو کو قانونی حقوق دیے اور نہ سیاسی پارٹیوں نے اردو کے اس مطالبے کو آگے بڑھایا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آزادی کے بعد اردو کو ہندوستان کی زبانوں میں وہ جگہ نہ مل سکی جو ملنا چاہیے تھی۔ اور جس کا حاصل کرنا اس کا قدرتی حق تھا۔ اردو کے لیے جو بائیس لاکھ بالغوں نے اپنے دستخط کر کے صدر جمہوریہ کو جو درخواست دی تھی، اس درخواست کی شنوائی ابھی تک نہیں ہوئی حالانکہ اس درخواست میں جو مطالبہ تھا وہ بہت چھوٹا سا تھا۔ وہ یہ کہ اردو کو چاہے صرف وہ حقوق دیے جائیں جو حکومت کہتی ہے کہ اردو کو ملنا چاہیے لیکن دیے جائیں وہ حقوق قانون کے ذریعے، تاکہ اگر حکومت کے افسران اردو کے مسئلے میں حق تلفی سے کام لیں تو مقدمہ چلایا جا سکے۔ لیکن کتنی افسوس کی بات ہے کہ یہ معمولی سا مطالبہ بھی ابھی تک منظور نہیں ہوا۔

یہ جمہوری دور ہے جس میں عوام کی رائے کو زیادہ دنوں تک دبایا نہیں جا سکتا ہے۔ اس لیے وہ دن دور نہیں ہے جب عوام کو اس بات کا احساس ہوگا کہ وہ جس زبان میں فلم کی کہانی کو سمجھتے ہیں جس زبان کے گیتوں یا غزلوں پر سر دھنتے ہیں وہ زبان اردو ہے اس لیے عوام کو چاہیے کہ وہ اردو کی حمایت کریں۔ اردو والوں کی پہلی تحریک دستخطی مہم تھی۔ دوسری تحریک ایسی عوامی تحریک ہونا چاہیے جس میں عوام کو فلموں کی زبان کے بارے میں بتایا جائے کہ وہ اردو ہے۔ اور اس کے سوا اردو کوئی اور زبان نہیں ہے اور اس زبان کو اگر تم پسند کرتے ہو تو اس کو باقی رکھنے کی جد و جہد کرو۔

یہ تحریک چونکہ بالکل عوامی تحریک ہے اور اس کا تعلق تقریباً سارے ہندوستان سے یہاں تک کہ جنوبی ہند سے ہے اس لیے اس تحریک کو چلانے کے لیے کافی زمانہ کی اور کافی جد و جہد کی ضرورت ہے لیکن زمانہ چاہے جتنا لگے ہم کو اس بات کا یقین ہے کہ اردو کو کامیابی ضرور حاصل ہوگی۔ ایک زمانے میں اردو کے دشمنوں کا خیال تھا کہ اگر فلموں کے بارے میں یہ پروپیگنڈہ کیا گیا کہ ان کی زبان اردو ہوتی ہے تو اردو کے مخالفین فلموں کے خلاف تحریکیں چلانے لگیں گے۔ ان تحریکوں سے تماشائیوں کی تعداد پر اثر پڑے گا جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ فلم ساز اپنے فلموں کی زبان کو بدلنے کی کوشش کریں گے۔ ایک زمانے میں یہ خیال صحیح تھا کیونکہ اس وقت اردو فلموں میں جگہ ڈھونڈ رہی تھی لیکن اب وہ زمانہ گزر چکا ہے۔ اردو فلموں میں جگہ پکڑ چکی ہے اور فلم سازوں کو یقین آ چکا ہے کہ وہی فلم کامیاب ہو سکتا ہے جس کی زبان نوے فیصدی بلکہ سو فیصدی اردو ہو۔ اس لیے اب فلموں کی زبان کو اردو کہنے سے کوئی خاص نقصان نہیں ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ ایسی صورت میں فلموں کے خلاف تحریک چلے اور ہو سکتا ہے کہ اس تحریک کا فلم سازوں پر کوئی اثر بھی ہو لیکن یہ باتیں عارضی ہوں گی کیونکہ زبان اس طرح نہیں بدلی جا سکتی ہے کہ جب فلم ساز چاہیں اس کو بدل دیں۔ زبان جو ہے رہے گی۔ اس لیے اب اردو دوستوں کو اردو کے پروپیگنڈے کی یہی راہ اختیار کرنا چاہیے۔

(اداریہ قومی آواز)

چندر پرکاش شاد

ایک رنگ

تجھ کو یہ معلوم تو ہوگا
اک سایہ دوجے سائے سے مل سکتا ہے
پھٹا ہوا دامن کانٹوں سے سِل سکتا ہے
تو ہی بتا پھر —
تجھ میں مجھ میں دوری کیسی
کیسی یہ بے کار بناوٹ
آ اور یہ بے معنی سی دیوار ہٹا دیں
گزرے ہوئے لمحات کو عبرتناک سزا دیں
تو بھی دکھی ہے میں بھی دکھی ہوں !!

حسن فیاض

آگہی

شب کے چھلکے ہوئے تاروں کی دلآویز چمک
چاند کے ساغرِ زریں سے اُبلتا ہوا نور
یہ افق تا بہ افق نور کی کرنوں کا ہجوم
یہ شفق زاروں کی رخشندہ و روشن راہیں
اور وہ صبح شعاعوں کا یہ رقصِ پیہم
پتی پتی پہ تھرکتی ہو شبنم کا سرور
کس سے پوچھوں کہ یہ رازِ دلِ فطرت کیا ہے
روشنی کیا ہے تجلی کی حقیقت کیا ہے
جب کبھی سوچا ہے یہ فطرت کے مناظر کیا ہیں
شب کی تنہائی میں آہستہ کوئی کہتا ہے
رازِ تخلیقِ دو عالم کو سمجھنے والے
تو نے سوچا ہے کبھی تیری حقیقت کیا ہے
بزمِ عالم کے لیے تیری ضرورت کیا ہے

خالد رحیم

چاند

اک مسافر
رات کے جنگل میں تنہا
پھر رہا ہے
جو ازل سے اپنی منزل ڈھونڈتا ہے

- - - -

غزلیں

اسرار اکبر آبادی

ہم خزاں میں رونقِ گلزار کی باتیں کریں
ظلمتوں میں بارشِ انوار کی باتیں کریں
گل فشاں ہونٹوں سے ذوقِ خار کی باتیں کریں
شاخِ گل کے ساتھ ہی تلوار کی باتیں کریں
یاس و حرماں کی فضا میں دل پریشاں ہو گیا
آ شبِ فرقت وصالِ یار کی باتیں کریں
جا ذرا اے دلکشیِ بہار و کیسی قسمت ہے کہاں
ہم کسی گلشن میں بیٹھیں یار کی باتیں کریں
بزمِ ہستی سے مٹا کر ظلمتِ تقسیمِ کہن
ہم نئے ذہنوں، نئے افکار کی باتیں کریں
بے خودی میں روحِ محفل کا کریں ہم تذکرہ
گھنگھروؤں کو چھوڑ کر جھنکار کی باتیں کریں
الجھنیں ہم قلبِ فطرت کی مٹانے کے لیے
آج اُن کے گیسوئے خمدار کی باتیں کریں
دیکھیے ہوتا ہے کیا ان کے شگفتہ دل کا حال
لالۂ گل سے جمالِ یار کی باتیں کریں
کہہ رہے ہیں آج وہ اپنے دلِ بیتاب سے
آؤ ہم تنہائی میں اسرار کی باتیں کریں

رئیس جنائی

ہم شہرِ آرزو میں گئے گھومتے ہوئے		اپنی ہی چاہتوں کے خدا ڈھونڈتے ہوئے
ہونے لگا ہے آج چمن میں ہوا کا رقص		پتے بھی ٹہنیوں سے گرے جھومتے ہوئے
چپ چاپ ہم بھی دجلۂ غم میں اتر گئے		کچھ لوگ دے رہے تھے صدا ڈوبتے ہوئے
حائل تھی درمیاں میں مگر روح کی فصیل
دل کا دیار آ گئے تھے ہم پوچھتے ہوئے

سید فضل المتین

آج یہ کیوں تو مجھ سے خفا ہے		بول کے آخر قصہ کیا ہے
بھولنے والے تیرا گلہ کیا		جو سوچا تھا وہی ہوا ہے
دنیا ہم کو یاد رکھے گی		اچھا ہے تو بھول گیا ہے
ترکِ تعلق کرنے والے		باقی کیسا ربط رہا ہے
سب کی نگاہیں مجھ پہ اٹھی ہیں		جب بھی تیرا ذکر چلا ہے
غیر جب اپنے ہو جاتے ہیں		وقت وہ مجھ پہ آن پڑا ہے
قسمت نے کیا گل یہ کھلائے		دوست بھی اب دشمن جاں رہا ہے
متیں کا کوئی شعر سنا دو		دردِ جگر میں جاگ رہا ہے
ذکر متیں، ان کا ذکر ہیں گے
فیصلہ ہم نے کر ہی لیا ہے

مراسلات

مطلوبہ اشعار اور مصرعوں کے سلسلے میں

(۱)

۱۵ رمئی ۱۹۶۶ء کے "ہماری زبان" میں بعض اشعار سے متعلق استفسار ہے۔ اس سلسلے میں مندرجہ ذیل اشعار سے متعلق معلومات مہیا ہیں۔

(۱) ہستی سے عدم تک ...... الخ، سودا کا شعر ہے۔
(کلیات سودا مرتبہ آسی ص ۲)

(۲) کشتوں کا تری چشم سیہ مست کے ...... الخ غالباً میر کا شعر ہے لیکن کلیات اس وقت سامنے نہیں

(۳) کون ایسا ہے ...... الخ، یہ بھی سودا کا شعر ہے
(کلیات سودا ص ۵۶۱)

(۴) زباں جلائی کیے ہاتھ قطع ...... الخ، داغ کا شعر ہے
(گلزار داغ ص ۲۵۳)

(۵) لے جو حشر میں ...... الخ، یہ بھی داغ کا شعر ہے
(گلزار داغ ص ۲۵۳)

(۶) چلی بھی برچھی کسی پر کسی کے آن لگی ... ذوق کا مصرع ہے
(دیوان ذوق مرتبہ آزاد ص ۲۱۶)

پہلا مصرع ہے:

نگہ کا وار تھا دل پر پھڑکنے جان لگی

(۷) دل کے ویرانے میں بھی ہو جائے دم بھر چاندنی۔
ناسخ کا مصرع ہے　(دیوان ناسخ دوم ص ۱۷۱)
صحیح پورا شعر یہ ہے

بھول کر اے چاند کے ٹکڑے ادھر آجا کبھی
میرے ویرانے میں بھی ہو جائے دم بھر چاندنی

(۸) لذت معصیت عشق ...... الخ، یہ شعر امراؤ جان ادا کا ہے
(ادارہ فروغ اردو، لاہور ص ۳۸۲)

خالد رسول کا اپنا ہے۔　(مالک رام)

(۲)

۱۵ رمئی ۱۹۶۶ء کے "ہماری زبان" میں ایک مراسلہ نگار نے بعض اشعار اور مصرعوں کی ایک فہرست دی ہے اور یہ جاننے کی خواہش کی ہے کہ یہ اشعار اور مصرعے کن شاعروں کی تصنیف ہیں۔ اس سلسلے میں جن اشعار یا مصرعوں کا ہمیں علم ہے ان کی نشاندہی کی جاتی ہے۔

(۱) نسیم صبح! تیری مہربانی
یہ مصرع علی نقی عیشی کا ہے اور پورا شعر اس طرح ہے

کہاں ہم اور کہاں یہ نکہت گل　　نسیم صبح تیری مہربانی

حوالے کے لیے دیکھیے جواہر سخن (جلد دوم) مرتبہ مبین کیفی چریاکوٹی شائع کردہ ہندستانی اکیڈمی الہ آباد بسلسلہ انتخاب کلام عیشی۔

(۲) ہستی سے عدم تک نفس چند کی ہے راہ
دنیا سے گزرنا سفر ایسا ہے کہاں کا

یہ شعر سودا کا ہے۔ حوالے کے لیے دیکھیے کلیات سودا (جلد اول) مرتبہ عبدالباری آسی نیز "چمن بے نظیر" مرتبہ مولوی محمد ابراہیم (تذکرۂ ریختہ گویاں از گردیزی۔

(۳) یہیں ملیں گے تجھے نالۂ بلند ترے
یہ مصرع شاد عظیم آبادی کا ہے اور پورا شعر اس طرح ہے۔

کمند پھینک کے جا قصر یار پر اے شوق
وہیں ملیں گے تجھے نالۂ بلند ترے

حوالے کے لیے دیکھیے کلام شاد (حصہ اول) مطبوعہ مطبع جامعہ ملیہ علی گڑھ۔ دوسرے مصرعے میں "یہیں" کے بجائے "وہیں" ہے۔

(۴) کہ پانوں توڑ کے بیٹھے ہیں پائے بند ترے
یہ مصرع بھی شاد کا ہے اور اسی غزل سے لیا گیا ہے جس کا اوپر ذکر کیا گیا۔ پورا شعر اس طرح ہے

کہیں نہ جائیں گے "اختر" ترے کوچے سے
کہ پاؤں توڑ کے بیٹھے ہیں پائے بند ترے

(۵) اسی گھر میں جلایا ہے چراغ آرزو برسوں
یہ مصرع امیر مینائی کا ہے۔ پورا شعر اس طرح ہے

نہ کرائے یاس یوں برباد میرے خانۂ دل کو
اسی گھر میں جلایا ہے چراغ آرزو برسوں

حوالے کے لیے دیکھیے امیر مینائی کا دیوان "مراۃ الغیب"

(۶) کون ایسا ہے جسے دست ہو دلسازی میں
شیشہ ٹوٹے تو کریں لاکھ ہنر سے پیوند

یہ شعر سودا کا ہے۔ حوالے کے لیے دیکھیے کلیات سودا (جلد اول) مرتبہ آسی نیز "چمن بے نظیر" مرتبہ مولوی محمد ابراہیم

(۷) زباں جلائی کیے قطع ہاتھ پہنچوں سے
یہ بند و بست ہوئے ہیں مری دعا کے لیے

یہ شعر داغ کا ہے۔ حوالے کے لیے دیکھیے "گلزار داغ"

(۸) لے جو حشر میں لے لوں زبان ناصح کی
عجیب چیز ہے یہ طول مدعا کے لیے

یہ شعر بھی داغ کا ہے اور اسی غزل سے لیا گیا ہے جس کا اوپر ذکر آیا ہے۔ البتہ پہلے مصرعے میں "جو" کے بجائے "تو" ہے۔ ع لے تو حشر میں لے لوں زبان ناصح کی

(۹) نکل چلا ہے وہ کوسوں دیار حرماں سے
یہ مصرع مصحفی کا ہے اور پورا شعر اس طرح ہے

سراغ قافلۂ اشک کیجیے کیونکر　　نکل گیا ہے وہ کوسوں دیار حرماں سے

حوالے کے لیے دیکھئے جواہر سخن (جلد دوم) مرتبہ کیفی۔ دوسرے مصرعے میں "نکل چلا ہے" کی جگہ "نکل گیا ہے" درج ہے۔

(۱۰) چلی تھی برچھی کسی پر کسی کے آن لگی

یہ مصرع ذوق کا ہے اور پورا شعر یوں ہے ؎

نگہ کا وار تھا دل پر، پھڑکنے جان لگی
چلی تھی برچھی کسی پر کسی کے آن لگی

حوالے کے لیے دیکھئے دیوان ذوق مرتبہ محمد حسین آزاد

(۱۱) پیری سے کمر میں اک خم توقیر کی صورت مجسم

یہ شعر علامہ شبلی نعمانی کا ہے اور ان کی مثنوی "صبح امید" سے لیا گیا ہے جو سرسید کے بارے میں لکھی گئی تھی۔ پہلے مصرعے کی ترتیب غلط معلوم ہوتی ہے۔ اصل مصرع یوں ہے۔

"پیری سے کمر میں اک ذرا خم"

یہ تین شعر سلسلے کے ساتھ پڑھئے جو سرسید کے بارے میں ہیں ؎

صورت سے عیاں جلال شاہی چہرے پہ فروغ صبح گاہی
وہ ریش دراز کی سپیدی چھٹکی ہوئی چاندنی سحر کی
پیری سے کمر میں اک ذرا خم توقیر کی صورت مجسم

(۱۲) دل کے ویرانے میں بھی ہو جائے دم بھر چاندنی

یہ مصرع ناسخ کا ہے اور اصل میں یوں ہے۔

"میرے ویرانے میں بھی ہو جائے دم بھر چاندنی"

پورا شعر اس طرح ہے ؎

بھول کر او چاند کے ٹکڑے ادھر آ جا کبھی
میرے ویرانے میں بھی ہو جائے دم بھر چاندنی

حوالے کے لیے دیکھئے کلیات ناسخ دیوان دوم۔ اس غزل میں ایک شعر اور بھی اچھا ہے ؎

کہ یک شب تاب تھی گویا شب مہتاب وصل
چھپ گئی کیا دور سے صورت دکھا کر چاندنی

(۱۳) دہن کا ذکر کیا یاں سر ہی غائب ہے گریباں سے

یہ مصرع ذوق کا ہے۔ پورا شعر اس طرح ہے ؎

زباں پیدا کروں جوں آیا سینے میں پیکاں سے
دہن کا ذکر کیا یاں سر ہی غائب ہے گریباں سے

حوالے کے لیے دیکھئے دیوان ذوق مرتبہ محمد حسین آزاد۔ اس غزل کا یہ شعر بھی زبان زد ہے ؎

اسی باعث سے دایہ طفل کو افیون دیتی ہے
کہ تا ہو جائے لذت آشنا تلخی دوراں سے

(۱۴) بگڑنے میں بھی زلف اس کی بنا کی

یہ مصرع تسکین دہلوی شاگرد مومن کا ہے۔ پورا شعر یوں ہے ؎

نہ کچھ شوخی چلی باد صبا کی بگڑنے میں بھی زلف اس کی بنا کی

اس غزل کا یہ شعر بہت مشہور ہے ؎

ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے
کہے دیتی ہے شوخی نقش پا کی

حوالے کے لیے دیکھئے انتخاب سخن از حسرت موہانی

(۱۵) اب جس جگہ کہ داغ ہے یاں پہلے درد تھا

یہ مصرع میر کا ہے پورا شعر یوں ہے ؎

دل عشق کا ہمیشہ حریف نبرد تھا
اب جس جگہ کہ داغ ہے یاں آگے درد تھا

حوالے کے لیے دیکھئے کلیات میر مرتبہ عبدالباری آسی دیوان اول۔ دوسرے مصرعے میں "پہلے درد تھا" کی جگہ "آگے درد تھا" درج ہے۔ اس غزل کا یہ شعر عام طور پر مشہور ہے ؎

گزری مدام اس کی جوانان مست میں
پیر مغاں بھی طرفہ کوئی پیر مرد تھا

(۱۶) لذت معصیت عشق نہ پوچھ
خلد میں بھی یہ بلا یاد آئی

یہ شعر مرزا محمد ہادی رسوا کا ہے۔ پوری غزل ان کے ناول "امراؤ جان ادا" میں ملتی ہے

(۱۷) اسی کی سی کہنے لگے اہل حشر
کہیں پرسش داد خواہاں نہیں

یہ شعر مفتی صدرالدین آزردہ کا ہے۔ حوالے کے لیے دیکھئے تذکرہ گلستان سخن از قادر بخش صابر دہلوی۔

(خلیل الرحمٰن اعظمی)

(۳)

جو مصرعے برجستہ یاد پڑ گئے لکھے بھیجتا ہوں۔

(۱) نسیم صبح تیری مہربانی۔

پیش مصرعہ کہاں میں اور کہاں یہ نکہت گل!

کسی صوفی شاعر کا ہے عجب نہیں حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کا ہو

(۲) کس کس کی مہر ہے سر محضر لگی ہوئی

پیش مصرعہ۔ لاؤ تو قتل نامہ مرا میں بھی دیکھ لوں

(۳) غالباً داغ

(۴) غالباً مفتی صدرالدین آزردہ دہلوی ؎

(۵) گر رہی ہے یہ نبض بیمار ہم پر بھی ۔ مولانا شبلی "مثنوی صبح امید"

(۶) بگڑنے میں بھی زلف اس کی بنا کی ۔ غالباً اکبر الہ آبادی

(۷) لذت معصیت عشق نہ پوچھ
خلد میں بھی یہ بلا یاد آئی

غالباً مومن

(۸) مرزا محمد ہادی لکھنوی ۔ امراؤ جان ادا، اس شعر میں تخلص مرزا تھا۔ رسوا صرف ناولوں کے لیے تھا

(عبدالماجد دریابادی)

۴

بعد مطالعہ استفسار مندرجہ ہماری زبان "۱۵ مئی ۱۹۶۶ء" دو مصرعوں سے متعلق ذاتی معلومات پیش کر رہا ہوں۔

مصرع۔ "دنیا سے گزرنا سفر ایسا ہے کہاں کا"

مرزا محمد رفیع سودا کی مشہور غزل ("مقدور نہیں اس کی تجلی کے بیاں کا") کے قطعہ کا ہے۔

پورا قطعہ یہ ہے۔

سودا جو کبھی گوش سے ہمت کے سُنے تو
مضمون یہی ہے جرس دل کی فغاں کا
ہستی سے عدم تک نفس چند کی ہے راہ
دنیا سے گزرنا سفر ایسا ہے کہاں کا

دوسرے مصرعے

کس کس کی مہر ہے سرِ محضر لگی ہوئی

کا پہلا مصرع اس طرح ہے

"لاؤ تو قتل نامہ ذرا میں بھی دیکھ لوں"

یہ شعر حضرت جلیل مانک پوری کی ایک غزل "تہمت تمہارے عشق کی ہم پر لگی ہوئی" کا بتایا جاتا ہے۔ سنا ہے کہ جب اعلیٰ حضرت سابق شہریار دکن محبوب علی خاں صاحب مرحوم نے اپنے چند خاص معتقدوں کی سیاسی سازش کے خلاف تادیبی کارروائی شروع کی تو ایک خفیہ دستاویز انھیں بتا کر اپنی تقریر کی ابتدا اسی شعر سے کی تھی۔

جن صاحب نے یہ واقعہ بیان کیا تھا اُن سے معلوم ہوا کہ معتوبین میں مولانا محمد علی، ظفر علی خاں اور مولانا عبد الماجد بدایونی اور اسی صف کے دوسرے ممتاز لیڈر شامل تھے۔

مگر مجھے انتخاب جلیل میں یہ غزل نہیں ملی۔ شیفتہ نے بھی اسی زمین میں ایک غزل کہی ہے۔ جس کا مقطع ہے۔

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ
اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی

یہ شعر ان کی غزل کا بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن جلیل مانک پوری سے ہی منسوب ہے۔

(خاور جلیل پوری)

۵

شعر:۔

کون ایسا ہے جسے دست ہو دلسازی میں
شیشہ ٹوٹے تو کریں لاکھ ہنر سے پیوند

یہ شعر سودا کا ہے اور آب حیات کے پرانے اڈیشن کے صفحہ ۱۴۹ پر درج ہے جہاں مصنف نے بجا شاید

فارسی کے اثرات کا ذکر کرتے ہوئے اردو شاعری میں فارسی کے ترجمہ شدہ محاورات کے استعمال کی مثالیں دی ہیں۔

(ک۔ ب۔ پرواز)

ابہام اور کنایہ

یکم / اپریل ۱۹۶۶ء کے "ہماری زبان" میں ایک خبر زیر عنوان "جدید اردو شاعری میں ابہام" نظر نواز ہوئی اس سلسلے میں فاضل مقررین نے "رمزیت" "ایمائیت" اور "اشاریت" کی اصطلاحات کا استعمال کیا تھا۔ مندرجہ ذیل سطور میں ان کی تشریح کی گئی ہے۔

مذکورہ بالا اصطلاحات "کنایہ" کی اقسام ہیں۔ کنایہ کے لغوی معنی ہیں تصریح کو ترک کرنا اور اصطلاح فن میں اس لفظ کو کہتے ہیں جس سے لازم معنی کا ارادہ ظاہر کیا جاتا ہے۔ اس کی مندرجہ ذیل اقسام ہیں:۔

تعریض :۔ اس کے معنی ہیں اشارہ دار ارادہ بہ جانب دیگر اس میں جس کی توصیف مقصود ہوتی ہے اس کا ذکر نہیں کرتے۔ مثلاً "مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان محفوظ رہیں"۔ اس میں یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ ظالم مسلمان نہیں ہوتا۔

تلویح :۔ بہ معنی دور سے اشارہ کرنا۔ اسی میں ذہن لازم سے ملزوم تک چند واسطوں سے منتقل ہوتا ہے۔ مثلاً کثیر الرماد (زیادہ راکھ : والا) ظاہر ہے کہ راکھ کثیر مقدار میں اسی کے یہاں سے نکلتی ہے جو کھانا زیادہ مقدار میں پکواتا ہے یعنی جو سخی ہوتا ہے۔

رمز :۔ بہ معنی نزدیک سے خفیہ اشارہ کرنا۔ اس میں انتقال ذہن اس طرح ہوتا ہے کہ لزوم میں کوئی خیال غیر شعور میں پوشیدہ ہوتا ہے مثلاً عریض القفا یا طویل القامت بہ معنی بے وقوف۔ علم قیافہ کی رو سے ایسے اشخاص بے وقوف سمجھے جاتے ہیں اور یہی خیال ذہن نشین رہتا ہے۔

ایما و اشارہ :۔ اس میں نہ وسائط ہوتے ہیں نہ کوئی امر خفی۔ مثلاً خاتم النبیین بہ معنی آخری نبی۔ کیونکہ کسی فرمان پر مہر کا ثبت ہونا اشارہ ہے اس کی تکمیل کا۔

ماہرین علم بلاغت متفق ہیں کہ کنایہ اور مجاز تصریح سے زیادہ بلیغ ہوتا ہے کیونکہ ان میں انتقال ذہن ملزوم سے لازم تک ہوتا ہے۔ اسی طرح استعارہ تشبیہ سے قوی تر ہے کیونکہ مشبہ کو عین مشبہ بہ قرار دیتے ہیں جیسے

دو نرگس کماں کش، دو گل زرہ پوش (فردوسی)

ابہام اور کنایہ میں نمایاں فرق ہے۔ ابہام میں معنی تک رسائی قریب قریب محال ہوتی ہے۔ اس کی کئی صورتیں ہوتی ہیں جن میں دو خاصۃ الورود ہیں "تعقید معنوی" اور "مجاز مستبعد" مثلاً

نرگس کو باغ میں جانے نہ دینا کہ ناحق خون پروانے کا ہوگا

یا

تصویر یار ہمرہ نکیرین ساتھ ہے رکھ دو ہماری قبر میں شیشہ گلاب کا

(یوسف علی پٹنہ)

شمالی بہار اردو کانفرنس کو کامیاب بنانے کی اپیل

"شمالی بہار اردو کانفرنس" جو بہت ہی عظیم الشان پیمانے پر ۴ / ۵ / جون ۱۹۶۶ء کو بمقام چپا قلعہ سیوان ضلع سارن منعقد ہو رہی ہے۔ اس کا انعقاد نہایت مناسب و بر وقت ہے۔ اہل سیوان نے "گوپال گنج کی اردو بچاؤ کانفرنس" کے فوراً بعد ہی اقدام کر کے جس عزم، بیداری اور حوصلہ مندی کا ثبوت دیا ہے وہ لائق صد تحسین و ستائش ہے اور ضرورت ہے کہ تمام اردو دوست ان کی آواز پر لبیک کہیں۔ اس لیے تمام محبانِ اردو سے عموماً اور شمالی بہار کے ذی اثر و اقتدار حضرات سے خصوصاً استدعا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں کانفرنس میں شرکت فرمائیں اور ہماری حوصلہ افزائی فرمائیں۔

شمالی بہار کے اردو دوست اداروں، انجمنوں، اسکولوں، کالجوں اور اردو لائبریریوں سے گزارش ہے کہ وہ اپنا ایک ایک نمائندہ کانفرنس میں شرکت کے لیے ضرور بھیجیں۔

شمالی بہار کی تمام شاخوں کو ریاستی انجمن ترقی اردو بہار کی طرف سے ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ اپنے دو دو نمائندے کانفرنس میں بھیجیں۔

شمالی بہار کے تمام اردو دوست ممبرانِ پارلیامنٹ، ممبران کونسل، میونسپل کمشنر، اساتذہ و پروفیسر حضرات سے گزارش ہے کہ شریک کانفرنس ہو کر اپنے مدبرانہ و گراں قدر مشوروں سے مستفید فرمائیں اور غور و فکر کے بعد کوئی صحیح راہ عمل تجویز فرمائیں۔ کانفرنس میں حسب ذیل حضرات کو شرکت کی دعوت دی گئی ہے۔

(۱) عالی جناب ڈاکٹر سید محمود ایم۔ پی (۲) پنڈت سندر لال جی (۳) پنڈت آنند نرائن ملا (۴) پروفیسر آل احمد سرور (۵) صاحبہ بدرالہ ایم۔ پی (۶) ڈاکٹر عبد الجلیل فریدی (۷) غلام سرور ایڈیٹر سنگم پٹنہ (۸) سید مظہر امام ایم۔ پی

(ضمان اللہ ندیم آفس انچارج ریاستی انجمن بہار)

مزاح نگاروں کی کل ہند کانفرنس

حیدرآباد ۲۰ اکتوبر۔ مزاح نگاروں کی کل ہند کانفرنس کا آخری اجلاس اردو ہال میں اختتام کو پہنچا۔ سمپوزیم میں صدارتی تقریر کرتے ہوئے ڈاکٹر مسعود حسین خاں صدر شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ نے کہا کہ اردو کے طنز و مزاح کا ادب دوسری زبانوں کے مقابلہ میں کمتر درجہ کا نہیں ہے۔ انھوں نے کہا کہ رشید احمد صدیقی اور پطرس کی تحریروں میں نہایت اعلیٰ درجہ کا مزاح ملتا ہے۔ پطرس واقعاتی مزاح کے بادشاہ ہیں۔ سمپوزیم میں ڈاکٹر انور معظم نے ایک مقالہ موجودہ دور میں طنز و مزاح پیش کیا۔ مباحثہ میں حصہ لیتے ہوئے جناب کرشن چندر نے کہا اردو ظرافت انگریزی ظرافت سے کم درجہ کی نہیں اور روسی ظرافت سے بہتر اور جرمنی ظرافت سے بدرجہا بہتر ہے۔ اردو میں طنز و مزاح کے ادب کو ترقی دینے کے لیے ماضی حال اور مستقبل کے رشتہ کو سمجھنا ضروری ہے۔

ہمارے مزاح نگاروں نے نئی صنعتی تہذیب سے اچھی طرح آگاہی نہ ہونے اور مستقبل کے امکانات واضح نہ ہونے کی وجہ سے احساس کمتری کا مظاہرہ کیا تھا یہ بات رفتہ رفتہ ختم ہوتی جا رہی ہے۔ نئے طنز و مزاح میں شعور بیدار نظر آتا ہے۔ زینت ساجدہ صاحبہ نے کہا کہ مردہ دلوں کو زندہ کرنا مزاح نگاروں کا کام ہے جو تنہائی میں اپنے زخموں پر خود ہنستے ہیں اور دوسروں کو بھی ہنسنے کا موقع دیتے۔

اختر حسن نے کہا کہ اردو کے طنز و مزاح کے ادب سے مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہمارا ادب اونچے درجہ اور بلاغت کی منزل پر پہنچ چکا ہے اور مستقبل میں یقیناً آگے بڑھے گا۔

جناب شفق تبسم نے کہا کہ مزاح کو صنف نہیں اظہار کا طریقہ کہنا چاہیے۔ انشائیہ اور افسانہ سنجیدہ بھی ہو سکتا ہے اور مزاحیہ بھی۔ مباحثہ میں حصہ لینے والوں میں جناب راج بہادر گوڑ، فرقت کاکوروی اور احمد جمال پاشا شامل تھے۔ صبح ادبی اجلاس میں مجتبیٰ حسین، یوسف ناظم اور کرشن چندر کے مضمون بہت پسند کیے گئے۔

([illegible])

ادبی مجلس کی خصوصی نشست

نئی دہلی ۲۰ رمئی۔ کل شام یہاں ادبی مجلس کی ایک خصوصی نشست میں دلّی کے ممتاز ادیبوں اور شاعروں نے جناب شمیم کرہانی

کے فن اور شخصیت کو خراج ہائے تحسین پیش کیے۔

جناب گوپی ناتھ امن نے نشست کی صدارت کی۔

ادبی مجلس کی یہ نشست جناب شمیم کرہانی کو اترپردیش کی حکومت کی طرف سے ان کے مجموعہ کلام "عکس گل" پر ۸۰۰ روپے کا انعام ملنے کے اعزاز میں منعقد کی گئی تھی۔

جناب شمیم کرہانی کو نثر اور شعر میں گل ہائے تحسین پیش کرنے والوں میں کمال کی وحدت تاثر تھی۔ مختلف اصحاب کی آراء ایک ہی تصور کی تخلیق ہوتی رہی کہ جناب شمیم دولت احساس، ندرت اظہار اور انسان دوستی میں اپنی نظیر آپ ہیں۔

جناب رشید حسن خاں نے کہا کہ شمیم صاحب ایک باکمال شاعر ہیں۔ وہ اپنے اشعار میں جن تلخ حقیقتوں اور اچھی باتوں کا اظہار کرتے ہیں انھیں شدت سے محسوس بھی کرتے ہیں۔

جناب جاوید وششٹ نے "عکس گل" ہی کے عنوان سے اپنی ستائشی نظم سنائی۔

جناب علی جواد زیدی نے کہا کہ شمیم صاحب نے شعر گوئی میں فن کا دامن نہیں چھوڑا۔ ان کی وطنی شاعری میں اخلاص اور جذبے کی گہرائی ہے۔ وہ اپنے ہم عصروں سے اس لیے ممتاز ہیں کہ ان کے وطنی نظریوں میں ٹھہراؤ ہے۔ یہی بات جناب دگل نے اپنی نظم میں کہی۔

زیدی صاحب نے کہا کہ شمیم صاحب کی شاعری کسی رقمی انعام سے نہیں ناپی جاسکتی۔ ہاں اس انعام سے خود انعام کا وزن کچھ بڑھ سکتا ہے۔

شمیم صاحب نے اظہار تشکر کے ساتھ کہا کہ احباب کی تحسین سے ان کا حوصلہ بڑھا ہے اور وہ آئندہ اور زیادہ کام کریں گے۔

صدر نشست جناب گوپی ناتھ امن نے کہا کہ اس پرلطف محفل میں پڑھی جانے والی ستائشی نظمیں غزل سے کم شان نہ رکھتی تھیں۔ سچ تو یہ ہے کہ جب ممدوح بلند ہو تو اظہار تحسین بھی بلند ہوجاتا ہے۔ امن صاحب نے کہا کہ شمیم صاحب کے کلام میں شان انفرادیت ہے۔ وہ شاعری کی ہر صنف پر قادر ہیں لیکن ابھی ان کا مشن ختم نہیں ہوا۔ ان کی عمر صرف ۵۱ سال ہے۔ اب وہ عظیم تر منزلوں کی طرف قدم بڑھا سکتے ہیں۔

نشست میں جناب گوپال متل، جناب رفعت سروش، جناب کرشن موہن، جناب مخمور سعیدی، جناب محسن زیدی، جناب ساقی لکھنوی، جناب ست نام سنگھ، جناب علی جواد زیدی اور جناب امن نے بھی اپنا کلام سنایا۔ جو بہت پسند کیا گیا۔

شمیم صاحب نے دیگر کلام کے علاوہ اپنی ایک تازہ ترین غزل بھی سنائی۔

(گوپی چند سکریٹری)

یوپی میں اردو کو دوسری سرکاری زبان قرار دیا جائے

اردو محافظ دستہ کا مطالبہ

بمبئی، ۲۳ رمئی۔ ملک کی مقبول عام زبان اردو کے ساتھ کانگریسی دور حکومت میں ہونے والی ناانصافی اور اس کے جائز اور جمہوری حقوق کی پامالی کی طرف حکومت اور برسر اقتدار جماعت (کانگریس) کے ارباب حل و عقد کو توجہ کرنے اور اردو کو اس کے آئینی حق دلانے کے لیے اردو محافظ دستہ اترپردیش کے کارکنوں نے کل یہاں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی اجلاس گاہ کے قریب ایک احتجاجی مظاہرہ کیا۔ اور مطالبہ کیا کہ اترپردیش اور ملک کے تمام صوبوں اور علاقوں میں اردو کے آئینی حقوق بحال کیے جائیں۔

مظاہرین کی قیادت شاہ فاروق عطا کر رہے تھے۔ اس موقع پر ۲۴ گھنٹہ کی علامتی بھوک ہڑتال بھی کی گئی۔

بعد میں اردو محافظ دستہ کے ایک وفد نے اپنے مطالبات پر مشتمل ایک یادداشت بمبئی پردیش کانگریس کمیٹی کے سکریٹری کے حوالے کی سکریٹری نے یقین دلایا کہ وہ اسے صدر کانگریس جناب کامراج نادر تک پہونچا دیں گے۔

(سیاست جدید)

اردو کی تعلیم کے سلسلے میں ریاستی انجمن ترقی اردو اترپردیش کا

ایک اہم اعلان

ہم ان لوگوں کو جن کی مادری زبان اردو ہے، اس بات کی طرف توجہ دلانا چاہتے ہیں کہ انھیں اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ ان کے بچے اپنی تمام ابتدائی تعلیم (درجہ ایک سے درجہ پانچ تک) اور ثانوی تعلیم درجہ چھ سے بارھویں درجہ تک) اردو زبان اور اردو رسم خط میں حاصل کریں۔

محض یہی کافی نہیں ہے کہ وہ صرف اردو زبان پڑھیں بلکہ نصابی نصاب کے جملہ مضامین مثلاً حساب، تاریخ، جغرافیہ، سائنس وغیرہ کا ذریعہ تعلیم بھی اردو ہی ہو اور نصابی کتابیں بھی اسی زبان میں ہوں۔

اردو داں والدین کے بچے اردو زبان اپنی ماں کی گود سے سیکھنا شروع کرتے ہیں۔ ان کے ماحول میں بھی صرف اسی زبان کا استعمال ہوتا ہے وہ اسی زبان میں سوچتے ہیں اور اسی زبان میں اپنے خیالات اور جذبات کا اظہار کرتے ہیں؛ اسی زبان کی بدولت ان کی دماغی نشو و نما ہوتی ہے۔ اور اسی زبان کے استعمال سے وہ اپنی تہذیبی اور مذہبی وراثت حاصل کرتے ہیں۔ فن تعلیم کا یہ بنیادی اصول ہے کہ بچوں کو ابتدائی اور ثانوی تعلیم مادری زبان کے ذریعہ دی جائے۔ اس طرح وہ جو مضمون بھی پڑھیں گے آسانی سے ذہن نشین کر لیں گے۔ اور انھیں محنت بھی کم کرنی پڑے گی یہی وجہ ہے کہ دنیا کے تمام ملکوں میں طالب علموں کی مادری زبان ہی ذریعہ تعلیم ہوتی ہے۔ خاص کر ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے لیے تو مادری زبان بہت اہمیت رکھتی ہے۔

آج کل مدارس میں تمام مضامین کا ذریعہ تعلیم ہندی ہے ظاہر ہے کہ اردو داں بچوں کے لیے ہندی غیر مادری زبان ہے جب انھیں تمام مضامین ہندی میں پڑھائے جاتے ہوں تو ان کے دماغ پر دگنا بوجھ پڑتا ہے ایک تو غیر مادری زبان پڑھنے سمجھنے کا بوجھ اور دوسرے مضامین یاد کرنے کا بوجھ۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ طوطے کی طرح ان مضامین کو رٹتے ہیں۔ اور محض قوت حافظہ کی مدد سے امتحانات میں پاس ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ چونکہ انھیں امتحانات کے پرچوں کے جوابات بھی ہندی میں لکھنا پڑتے ہیں۔ اس لیے وہ بعض اوقات فیل ہو جاتے ہیں۔ اور اگر پاس بھی ہوتے ہیں تو انھیں اچھا ڈویژن نہیں ملتا۔ ان کی امتحانات میں کمزوری اور ناکامیابی کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کی تعلیم غیر مادری زبان میں ہوتی ہے۔

والدین کو یاد رکھنا چاہیے کہ تعلیم کا محض یہ منشا نہیں کہ طلبہ مضامین کو طوطے کی طرح رٹ کر امتحان پاس کر لیں اور پھر خوشامد در آمد سے ملازمت حاصل کر لیں۔

حامیان اردو کو یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اردو زبان کا علم محض ایک زبان کی حیثیت سے ہی اہمیت نہیں رکھتا بلکہ تہذیبی اور مذہبی اعتبار سے بھی اس کا جاننا لازمی ہے۔ ہر ایک زبان کے ساتھ ایک کلچر وابستہ ہے۔ اردو زبان کا بھی ایک ثقافتی پہلو ہے۔ ان کا تمام تہذیبی، ادبی اور علمی سرمایہ اردو زبان میں ہے جو ان کے بزرگوں کی صدیوں کی کوششوں کا نتیجہ ہے اگر اس زبان کا ان کی غفلت کی بدولت خاتمہ ہو گیا تو ان کے اور ان کے بزرگوں کے علمی اور ثقافتی کارناموں کا نام و نشان مٹ جائے گا ان کی زبان ایک ترقی یافتہ زبان ہے اس میں ہر قسم کا ادبی و علمی سرمایہ موجود ہے مگر ان کی لاپرواہی کی بدولت اس کی ترقی رک گئی ہے۔

اردو کی طرف سے غفلت کی وجہ سے ہزاروں آدمیوں کے ذریعہ معاش کا خاتمہ ہو گیا اردو کے مصنف ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے ہیں، اردو کاتب، مطابع اور کتب فروش کثیر تعداد میں بیکار ہو گئے ہیں۔

اہل اردو کو اگر اردو سے محبت ہے اور اگر وہ اپنی اولاد کی بہتری چاہتے ہیں اور اپنی مادری زبان و ادب کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں تو حسب ذیل مشورے پر عمل کریں۔

۱۔ اپنے بچوں کو ایسے مدارس میں داخل کرائیں کہ جہاں کا ذریعہ تعلیم اردو ہو یا جہاں کم از کم اردو زبان لازمی طور پر پڑھائی جاتی ہو۔

اسکول میں داخلے کے وقت اپنے بچے کی مادری زبان اردو لکھوائیں اور ہیڈ ماسٹر یا پرنسپل سے درخواست کریں کہ اس کو مختلف مضامین کی تعلیم اردو زبان اور اردو رسم الخط کے ذریعہ دی جائے۔

اگر ممکن ہو تو کم از کم دس بچوں کا ابتدائی درجہ میں داخلہ دس سرپرست مل کر کرائیں اور ہیڈ ماسٹر سے درخواست کریں کہ ان کو اردو زبان کے ذریعہ جملہ مضامین پڑھائے جائیں اپنڈ کا حکومت اترپردیش نے اپنے بیان (مطبوعہ گورنمنٹ گزٹ مورخہ ۱۴ جنوری ۱۹۵۹ء) میں وعدہ کیا ہے کہ اگر کسی جماعت میں دس اردو داں بچے یا کسی اسکول میں چالیس اردو داں بچے ہوں گے تو ان کی ابتدائی تعلیم کا انتظام اردو میں کر دیا جائے گا۔

آپ ان تمام اداروں اور افراد کے ساتھ تعاون کریں اور ان کی مدد کریں جو اردو کو بھی اترپردیش کی علاقائی زبان بنوانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

اگر اردو تعلیم کے سلسلے میں کچھ مشکلات پیش آئیں، اور مدارس کے ہیڈ ماسٹر وغیرہ آپ کی شنوائی نہ کریں تو مندرجۂ ذیل اصحاب سے مل کر یا بذریعہ تحریر مشورہ کیا جائے۔

۱۔ پنڈت آنند نرائن ملا۔ صدر انجمن ترقی اردو، جینا باز اگیٹ لکھنؤ۔

۲۔ ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی۔ سکریٹری انجمن ترقی اردو لکھنؤ۔

اگر کوئی ہیڈ ماسٹر یا پرنسپل یہ کہے کہ اردو ہندی میں کوئی فرق نہیں لہذا ہندی تعلیم سے کوئی ہرج نہیں تو آپ ان کی باتوں پر یقین نہ کریں اور ان سے پرزور الفاظ میں کہیں کہ ہم اپنے بچے کی تعلیم اردو زبان اور رسم الخط میں چاہتے ہیں۔

(منجانب انجمن ترقی اردو لکھنؤ)

نیاز فتح پوری کا کراچی میں طویل بیماری کے بعد انتقال

لکھنؤ ۲۴ رمئی۔ اردو کے ممتاز ادیب اور مصنف جناب نیاز فتح پوری، مدیر ماہنامہ نگار کا انتقال آج صبح کراچی میں ہو گیا۔ یہ خبر یہاں انتہائی افسوس سے سنی گئی۔

نیاز صاحب کی عمر تقریباً ۸۰ سال تھی۔ انھوں نے اپنے پس ماندگان میں علاوہ بیوہ کے ۲ لڑکے جو زیر تعلیم ہیں اور ۳ لڑکیاں چھوڑی ہیں یہ سب پاکستان میں ہیں۔ ان کی ایک مرحومہ بیٹی اہلیہ مجید نیازی (لکھنؤ) کے بیٹے بھی ہیں جو نیاز صاحب کے نواسے ہیں اور اپنے باپ کے ساتھ یہاں ہیں۔

نیاز صاحب جو اردو ادب میں اپنی طویل خدمت اور مخصوص اسلوب کی بنا پر ایک خاص مقام رکھتے ہیں فتح پور ہسوہ میں پیدا ہوئے۔ فارسی اور عربی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد پہلے انھوں نے یو۔پی پولیس میں ملازمت اختیار کی اور سب انسپکٹر مقرر ہوئے مگر جلد ہی اس ملازمت سے سبکدوش ہو کر انھوں نے اردو ادب کی طرف توجہ کی بیسویں صدی کی دوسری دہائی کے آخر میں انھوں نے اپنا رسالہ ماہنامہ نگار پہلے بھوپال سے نکالا۔ تیسری دہائی کے وسط میں نیاز صاحب اپنے رسالے کے ساتھ لکھنؤ آ گئے اور یہاں مستقل طور پر قیام پذیر ہو گئے۔ چھٹی دہائی کے آخر میں صدر جمہوریہ ہند نے انھیں پدم بھوشن کا اعزاز عطا کیا۔ اور ساتویں دہائی کے شروع میں یعنی ۱۹۶۲ء میں وہ ترک وطن کر کے پاکستان چلے گئے اور رسالہ نگار وہاں بھی انھوں نے نکالا۔

نیاز صاحب کو جو کراچی میں رہتے تھے آخر میں جبڑے کا کینسر ہو گیا تھا جس کے سلسلے میں تین بار ان کے جبڑے کا آپریشن ہوا اور اسی مرض میں ان کا انتقال آج صبح ہوا۔ اور آج ہی کراچی میں ان کو سپرد خاک کر دیا گیا۔

نیاز فتح پوری جن کا پورا نام نیاز محمد خاں تھا اردو کی کئی درجن کتابوں کے مصنف تھے۔

(قومی آواز)

"ہماری زبان" کو مضامین نظم و نثر بھیجتے وقت اس کا خیال رکھیے کہ وہ خوشخط اور کاغذ کے ایک طرف لکھے ہوں۔

صفحہ ۳ سے آگے

اور گوشوارے میں اردو جاننے اور لکھ سکنے والوں، اردو بول سکنے والوں اور اردو سمجھ سکنے والوں کا سرے سے کوئی ذکر نہیں اگر انھیں بھی شامل کیا جائے تو ہم ماہرانہ اندازے کے مطابق اردو جاننے والوں کی تعداد ۳۵ لاکھ یعنے کل آبادی کا ۱۰ فی سیکڑہ ٹھہرا سکتے ہیں۔ پھر بھی اردو کو تامل، کنڑی، اوڑیہ وغیرہ کے مماثل قرار دے کر اردو کی توہین کی گئی۔ اردو کو صرف یہ اعزاز بخشا گیا کہ قانون میں محدود، مشروط اور مخلوط طور پر نام سے سرفراز کیا گیا۔

رشک آتا ہے ہمارے احسان مند اور احسان شناس بھائیوں کی فطرت و شرافت پر جو اسی کو بہت بڑی عزت افزائی سمجھتے ہیں۔ خوب کہا تھا اکبر الہ آبادی نے۔

ہر چند بے وقار ہیں مرزا کو غم نہیں
کیا کم ہے یہ شرف کہ وفاتی سے کم نہیں

اخباری اطلاعوں کی بموجب حکومت کے بعض شیدائی تحسینی جلسے منعقد کرانے اور قانون سازوں کی گل پوشی کرنے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ بے اختیار ٹھیٹھ دیہاتی دکنی میں لکھا ہوا ایک شعر یاد آ رہا ہے جو نظام شاہی حیدرآباد کے ڈوبتے ہوئے راج، گھٹتے ہوئے اقتدار اور فنا ہوتے ہوئے اعزاز کے زمانے میں اور اس وقت کے زوال پذیر، زوال آلودہ اور زوال فریفتہ حیدرآبادیان باقتدار، شیران سلطنت، امرائے عظام اور شہزادگان بلند اقبال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

پڑتے جائیں تالیاں ہو بے شمار
پن کی تم پھنستیچ جارئیں رے تجا!

(بے شمار تالیاں بجائی جا رہی ہیں مگر شاباش ہے تم پر کہ پھنستے ہی جا رہے ہو!)

(ادارے کا مضمون نگار کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں (ادارہ ہماری زبان))

"ہماری زبان" کے خریداروں سے ایک گزارش

"ہماری زبان" کے خریداروں کے پتوں کی فہرستوں کو از سر نو ترتیب دیا گیا ہے جس کی وجہ سے خریداروں کے نمبر خریداری یکم جون سے بدل گئے ہیں، اس لیے خریداروں سے گزارش ہے کہ اس شمارے کے پتے پر مندرج اپنے نئے خریداری نمبر نوٹ کر لیں اور آئندہ نئے نمبروں کے حوالے سے خط و کتابت کریں۔

منیجر "ہماری زبان"

مالک انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ پرنٹر پبلشر نصیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھاپا اور ... حسن نے دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شائع کیا۔